

نسوانی حقوق کی تحریکات

اُن کے محرکات اور ان کے ثمرات

(جناب ملک غلام علی صاحب)

ترجمان کے صفحات میں حکومت کی قائم کردہ "حقوق نسواں کمیٹی" کی رپورٹ پر ہمارا تبصرو و تجزیہ خاصا طویل ہو چکا ہے۔ تاہم اس بحث کے بعض اہم پہلو ابھی تک تشنہ تکمیل میں۔ اب تک کی گفتگو میں جو چیز پیش نظر رہی ہے وہ یہ ہے کہ بات کو بہت زیادہ نہ پھیلا یا جائے اور کمیٹی نے اپنی سفارشات کا جو حصہ دفعتاً کی شکل میں مرتب کیا ہے، بحث و نظر کو حتی الامکان اس تک محدود رکھا جائے۔ لیکن اس رپورٹ کی پشت پر جو عمرانی و تمدنی نظریات کا رفرما ہیں اور جن کے برگ و بار ان نظریات کے قائلین و عاملین کو اپنا ذائقہ چکھا چکے ہیں، جب تک ان کی کچھ تفصیل نہ بیان کی جائے، تصویر کا اصل رخ سامنے نہیں آتا۔ اس لیے اس پس منظر و پیش منظر کی بھی تھوڑی سی توضیح یہاں پیش کی جا رہی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس نوعیت کی سفارشات اس کمیٹی نے کی ہیں کوئی حقیقی اجتماعی یا تمدنی ضرورت ان کے لیے داعی نہیں تھی، نہ اُن سے کس بے انصافی کا ازالہ یا خرابی کی اصلاح مطلوب و متوقع ہے، بلکہ اصل مقصود جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ مغرب میں عورت تن تنہا یا مرد کے ہمراہ جن جن راہوں اور اونچی نیچی گذرگاہوں میں بھٹک رہی ہے پاکستان کی مسلمان خاتون بھی ضرور ان سب راستوں پر رواں دواں اور سرگرداں ہو اور اسی انجام سے دوچار ہو جس سے مغربی دنیا کی عورت دوچار ہو چکی ہے۔ اس رپورٹ میں جتنی بھی سفارشات اہم اور دُور رس نتائج کی حامل ہیں ان میں ایک بھی ایسی نہیں ہے جسے مغرب کے معاشرے میں آزما یا نہ جا چکا ہو اور جس کے تلخ ثمرات سے دلوں کے کام و دہن اور قلب و دماغ کو پوری طرح سیری نہ حاصل ہو چکی ہو۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ہمارے دلوں جو لوگ اس قسم کے تجربات دہرانا چاہتے ہیں وہ ان نتائج و عواقب

سب سے بڑی خبر یہی یا باخبر تو ہیں مگر جان بوجھ کر وہی صورت حال اپنے من پیدا کرنا چاہیے ہیں جو مغرب میں رونما ہو چکی ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ مغرب زدہ طبقے کی ایک قلیل تعداد کو چھوڑ کر پاکستان کے مسلمانوں کی عظیم اکثریت، خواہ وہ پڑھے لکھے افراد ہوں یا آن پڑھ ہوں، خواہ عورتیں ہوں یا مرد ہوں، اگرچہ ان پر سے مذہب و اخلاق کی گرفت ایک حد تک ڈھیلی پڑ چکی ہے، لیکن ان کے عادات و اطوار آخری حد تک نہیں بگڑے اور بفضل اللہ وہ دین و دانش سے بالکل بے بہرہ نہیں ہو چکے۔ اس لیے اگر انہیں بتایا جائے کہ مغرب کے صنعتی انقلاب اور فرانس اور روس کے خون آشام حوادث و اضطرابات نے مساوات، حریت وغیرہ کے جو کھوکھلے اور گمراہ کن نعرے ایجاد کیے تھے اور ان کے بل پر جس جنتِ ارضی کو وجود میں لانے کے دعوے اور وعدے کیے تھے وہ سب کے سب سُرِاب سے بھی زیادہ بے حقیقت ثابت ہوئے اور بالآخر انہوں نے روئے زمین کو جہنمِ زار بنا کر رکھ دیا، تو ہمیں اُمید ہے کہ مسلمان اس سے عبرت و موعظت حاصل کریں گے۔ اسی اُمید پر ہم چاہتے ہیں کہ مغرب کے بعض اہل فکر کی کچھ نگارشات ایک مناسب ترتیب کے ساتھ یہاں نقل کریں اور ان کی وساطت سے اپنی بہنوں اور بھائیوں کو غور و فکر کی دعوت دیں۔

سب سے پہلے ہم یونیورسل لائبریری کی شائع کردہ ایک کتاب کے چند اقتباسات دیں گے جس کا نام ”خاتونِ جاہلہ — جنسِ گم گشتہ“ (MODERN WOMAN — THE LOST SEX) ہے۔ اس کتاب کے متعلق پہلی قابل ذکر بات یہ ہے کہ اسے ایک مرد اور عورت نے مل کر تصنیف کیا ہے، اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ ”محض مردانہ یا محض زنانہ نقطہ نظر“ کی حامل ہے۔ یہ کتاب بڑی حد تک ایک متوازن، غیر جانبدارانہ اور معروضی زاویہ نگاہ سے مرتب کی گئی ہے۔ مرد مؤلف کا نام فرڈی نڈلینڈ برگ ہے جو صحافی، ماہرِ معاشیات، مؤرخ اور سوانح نویس (بیوگرافر) ہیں اور سوشل ہسٹری اور سیاسیات میں لیکچرر ہیں۔ عورت کا نام مرینیا ایف، فائن ہیم ہے جو ایم۔ ڈی اور نفسی و اعصابی امراض کی ماہرِ طبیبہ ہیں، پرائیویٹ علاج کرتی ہیں، نیز نیویارک کے ایک سرکاری ہسپتال سے منسلک ہیں، لندن اور وائٹا کے ہسپتالوں میں بھی تعلیم و تربیت لے چکی ہیں اور صاحبہٴ اولاد ہیں۔ یہ کتاب قریب پانسو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے آغاز اور ابواب، بعد میں جا بجا ”نظریہٴ مساواتِ مرد و زن“

کا ابطال کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ مرد اور عورت کو ہر حیثیت سے مساوی قرار دینے کے کتنے مہلک نتائج نکلے ہیں۔ چنانچہ صفحہ ۳۱ کی یہ عبارت ملاحظہ ہو۔

”عورت کا وجود مرد کے مقابلے میں پیچیدہ تر ہے۔ عورتوں کو قدرت نے نوالہ و تناسل کا ایک نازک اور دقیق نفی و جسمانی ودیعت کیا ہے جو مرد سے قطعی غیر مشابہ ہے۔ عورت کا اعصابی اور نفسیاتی نفی م بھی بہت پیچیدہ اور عمیق ہے جو پردے کا پورا وظیفہ ولادت کے گرد گھومتا ہے جس طرح ایک خط مستقیم اور ایک قوس اور مدورکمانی میں کوئی مشابہت نہیں، اسی طرح ایک مرد اور عورت میں بھی کوئی باہمی مشابہت نہیں۔“

اس کے بعد صفحہ ۴-۵ پر دکھایا گیا ہے کہ روس میں اشتراکی انقلاب کے بعد نسوانی تحریک FEMINISM بڑے زور شور سے چلی اور عورتوں کے معاملے میں ہر طرح کی بے قیدی اور ابا حیت کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ لیکن ۱۹۳۶ء کے بعد یک لخت اس پالیسی میں تغیر رونما ہوا۔ آزاد اور غیر رسمی شادیوں پر قدغن لگائی گئی، طلاق کے حصول کو عملاً ناممکن بنا دیا گیا، اسقاطِ حمل کو ناجائز سمجھا گیا، بچوں سے محروم عورت کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا گیا، اور عائلی زندگی کی خوبیوں اور تقدیس کے سرکاری طور پر گن گائے گئے۔

صفحہ ۱۱ پر ماڈرن عورت کی حالتِ زار ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

”زمانہ جدید کی عورت سے اس درجہ متضاد مطالبات کیے گئے ہیں کہ وہ تفکرات اور انجمنوں کا

ایک بندل بن کر رہ گئی ہے۔ جب تک اس کی جان میں جان ہے، وہ متنوع مصروفیات کے دوران میں شدید مسابقت اور مقابلہ سے دوچار ہے۔ آج کے دور میں وہ گھر سے نکل کر باہر کی دنیا میں آ کھڑی ہوئی ہے۔ اسے خارجی ماحول میں گھسیٹ لانے کا باعث ایک نو صنعتی اور مشینی انقلاب ہے اور دوسری وجہ وہ دانشور اور نظریہ پرست بہنیں ہیں جو اسے کشاں کشاں اس میدان میں لے آتی ہیں جہاں اس کے لیے مقابلہ ناگزیر ہے اور یہ مقابلہ اب مردوں سے زیادہ خود عورتوں کے ساتھ درپیش ہے۔ ایک وقت وہ مختا جبکہ اُسے اپنے شوہر کے معاملے میں کامل اعتماد تھا اور جدائی کا امکان کم ہی تھا۔ لیکن اب اُسے معلوم ہے کہ کئی عورتیں جو اسٹینو گرافیا سکرٹری ہیں، ہیٹ چیک کرنے والی یا ماڈل بننے والی لڑکیاں ہیں، یا فیشن کے ڈیزائن ترائیڈ ہیں، یا ویسے ہی مرد کو گھورتی پھرتی ہیں۔ یہ سب

کی سب شادی شدہ عورت کے شوہر کی ناک میں ہیں اور اسے پھین لینا چاہتی ہیں۔ افسانے، ناول، سنیما کا یہی موضوع ہے کیونکہ عالم واقعات میں یہی کچھ رونما ہو رہا ہے۔ اگر اس کا شوہر نہیں ہے اور اُسے رفیق حیات کی تلاش ہے تو وہ یہ جانتی ہے کہ جس چیز کی اُسے تلاش ہے، اور بہت سی عورتیں بھی اُسی کے پیچھے ماری ماری پھرتی ہیں۔ عورتوں کا کوئی مٹھکا نہ نہیں ہے، وہ کسی جگہ محفوظ و مصون نہیں بلکہ ان کے غول کے غول شکار کرنے اور شکار بننے کے لیے چار سو ادارہ پھرتے ہیں۔ یہ عورتیں چونکہ باسانی دستیاب میں اور جنسی اخلاق سے عاری ہیں، اس لیے مرد ان کے ساتھ کوئی آخری عہد کرنے اور بنا ہونے پر آمادہ نہیں ہوتے، اس لیے عورتیں اپنے اندر زیادہ سے زیادہ کشش پیدا کرنے اور بناؤ سنگار مہیا کرنے کی کوشش میں لگی رہتی ہیں۔ دوسری طرف تلاش محاش میں عورتوں کے بالقابل عورتیں بھی ہیں اور مرد بھی۔ یہ مقابلہ نہایت بے رحم اور جان لیوا ہوتا ہے۔ دفنوں اور کارخانوں کی سیاسیات میں افسری د ماتحتی کے عنصر کے ساتھ ساتھ مردانہ و زنانہ سیاسیات کا بھی دخل ہو جاتا ہے۔ ایسا سخت ہمہ جہتی مقابلہ عورت کو ہر لحظہ منتلائے تشویش رکھتا ہے۔

تہذیب جدید نے عورت کے اندر جو اس طرح کا ذہنی اضطراب اور اعصابی کھچاؤ پیدا کر دیا ہے، کتاب کے مرتبین کے نزدیک یہ اُن دماغی عوارض، کم بستی کے جرائم، معاشرے کے خلاف نفرت و بغاوت اور قلبی عدم سکون کا بنیادی باعث ہے جو مغربی معاشرے پر تیز رفتاری سے چھلتے چلے جا رہے ہیں۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث کے بعد تیسرے باب کا خاتمہ صفحہ ۱۷ پر ان الفاظ میں ہوتا ہے:

”یہ نتیجہ اخذ کیے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے کہ راحت و مسرت کے روز افزوں فقدان کا سبب

عزبت، بیماری، جسمانی ناکارگی یا عجز و کمزوری کی فوٹیدگی نہیں ہے۔ یہ عوارض تو رنج و الم میں صرف

اصناف کا باعث بنتے ہیں۔ یہ غم و اندوہ دراصل اعصابی اختلال (NEUROSIS) کا نتیجہ اور

خارجی مظاہرہ ہے۔ اور اس اعصابی فساد و اختلال کی پیدائش پیچپی میں نامناسب اور نامساعد گھریلو

ماحول سے ہوتی ہے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ عورتیں اور مائیں اس خرابی کی اصل ذمہ دار ہیں۔“

اس کے بعد ”گھر کی تباہی“ (DESTRUCTION OF THE HOME) کے عنوان سے ایک

مستقل باب تحریر کیا گیا ہے جس میں عورت کے گھر سے باہر آنے کے نتائج کو مزید تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ صفحہ ۹۳ پر لکھتے ہیں:-

”صنعتی انقلاب کے ہتھوڑے نے عورت کو مزہیں لگا لگا کر گھر سے نکالا اور مرد کے مشاغل میں عورت کو بھی منہمک کر دیا حالانکہ گھروہ مقام تھا جہاں عورت نے تہذیب و تمدن کے آغاز سے لے کر اب تک اپنا بہترین مادی و جذباتی سرمایہ لگایا تھا۔ گھر کی تباہی نے صرف عورت ہی کو ناخوش و بے قرار نہیں کر دیا بلکہ پوری سوسائٹی اس سے متاثر ہوئی ہے۔ ایک عمومی ابتری اور افراتفری کے لیے اسٹیج تیار ہو چکا ہے جس کے نتائج ہم سب عجبگت رہے ہیں۔ دماغی امراض اور اعصابی عوارض کے مریض جتنی کثیر تعداد میں اب پائے جاتے ہیں تاریخ انسانی میں اس کی مثال نہیں مل سکتی“

”آج کا گھر گھر نہیں بلکہ محض ایک رہائش گاہ ہے۔ بعض اسے ایک تغیر پذیر گھر قرار دیتے ہیں مگر یہ محض ایک خوش فہمی اور خیال آفرینی ہے۔ ماڈرن گھر کوئی نشوونما دینے والا ادارہ نہیں بلکہ سماجی نقطہ نظر سے ایک تخریبی آلہ ہے۔ چنانچہ حاکمانہ طاقتیں اور ایجنسیاں اپنے صحیح یا غلط نظام اجتماعی کے تحفظ کی خاطر ان جدید گھروں کو خود شبہ کی نگاہ سے دیکھتی اور گھر کے افراد کی منفی مگر کڑی نگرانی کر رہی ہیں۔ ان گھروں میں جو بے اطمینانی اور بے چینی جنم لے چکی ہے اور مزید اجتماعی بدنظمی کے لیے انڈے بچے دے رہی ہے، حکومتیں خواہ کتنی بھی جاسوسی کریں وہ اس کی روک تھام کے لیے ناکافی ہی ہوگی۔ یہاں جذباتی پن کا کوئی سوال نہیں ہے بلکہ یہ ایک حقیقت اور واقعہ ہے جس کا سامنا کرنا کر رہے۔“

اس کے بعد کتاب میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اس زمانے میں گھر بس مٹاپ یا مسافر خانہ بن کر رہ گئے ہیں جہاں گھر کے افراد فقط نہانے یا سونے کے لیے آتے ہیں، ورنہ دن رات کے بیشتر اوقات ایسے ہوتے ہیں جہاں گھروں میں سناٹا ہوتا ہے، البتہ تھیلے، قہوہ خانے، شراب خانے، ریسٹوران، رقص گاہیں اور لہو و لعب کے مراکز رات دن آباد رہتے ہیں۔ پھر یہ بیان کیا گیا ہے کہ عورت کے اندر سے بیوی یا ماں بن کر رہنے کا رجحان تیزی سے غائب ہوتا چلا جا رہا ہے اور بچوں کی پیدائش و پرورش کی قدر و قیمت عورت بلکہ پورے معاشرے کی نگاہوں سے گر گئی ہے۔ چنانچہ صفحہ ۱۲۲ پر اس صورت حال کا نقشہ ان الفاظ میں دیا گیا ہے:-

”پمپ اور ریاست نظریاتی اعتبار سے تو وظیفہ مادری (MOTHER HOOD) کی

بڑی مدح سرائی کرتے ہیں، لیکن ہر دیکھنے والی آنکھ دیکھ رہی ہے کہ ماں بننا اب عورت کو باعث منفعت

نظر نہیں آتا۔ اُس کے ساتھ اب کوئی مرتبہ و منزلت وابستہ نہیں ہے۔ جس طبقے کے ماتحت میں ذہنی و فکری قیادت ہے اور جو سوچ بچار کے پیمانے فراہم کرتا ہے وہ اپنے جتنے کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ جو عورت بچے کے جھنجھٹ سے آزاد ہو مگر مجلس قانون ساز کی ممبر، ایڈیٹر، انشا پرداز، ایکٹریس، ملازم، کاروباری ادارے کی منتظمہ یا معلمہ ہو، سوسائٹی اس کا احترام اُس عورت سے زیادہ کرتی ہے جو محض ماں بن کر گھر کی چار دیواری میں رہے۔ آج کل کی عورت کے لیے بے شمار نفسیاتی مشکلات ہیں، لیکن سب سے زیادہ عمیق مشکل اس کے لیے اولاد پیدا کرنا ہے۔ طبی اور اقتصادی نقطہ نظر سے تو حالات اُس کے لیے نہایت سازگار ہیں لیکن ذہنی اور نفسیاتی لحاظ سے عورت کی راہ میں شدید رکاوٹ حائل کر دی گئی ہے۔ برمنگھم کنٹرول کے حامی بچوں کی پیدائش کو ہمیشہ ایک معاشی آفت بنا کر پیش کرتے رہتے ہیں جس سے عورت کے ایک فطری فریضے کی بجا آوری میں رکاوٹ اور خلل رونما ہوتا ہے اور اس سے محرومی اُسے دماغی و نفسیاتی امراض کا شکار بنا دیتی ہے۔

منبط ولادت کی تحریک کا جو اندہ ابتداء میں اس بنیاد پر فراہم کیا گیا تھا کہ نسل انسانی جس رفتار سے کرۂ زمین پر بڑھ رہی ہے اس رفتار سے انسانی غذا زمین پر پیدا نہیں کی جاسکتی، اس لیے تنہا نسل ناگزیر ہے۔ لیکن یہ ایک ایسا نظریہ اور مفروضہ ہے جو تازہ ترین دریافت شدہ حقائق اور معلومات کی بنا پر صحیح ثابت نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں منبط ولادت کے لیے جتنے بھی آلات، تدابیر اور دوائیں ایجاد ہو سکی ہیں ان کا مضر صحت ہونا بھی شک و شبہ سے بالاتر نہیں رہا۔ لیکن اسقاط حمل اور منبط تولید چونکہ جنسی آوارگی و بے قیدی کا ایک نہایت مؤثر ذریعہ ہے، اس لیے مغربی تہذیب کے ولادہ مشرقی اور ایشیائی ممالک میں بھی اسے زبردستی رائج کرنے پر مصر ہیں خواہ کوئی قوم اس پر آمادہ ہو یا نہ ہو۔ حال ہی میں اندرا گاندھی کو جو انتخابی شکست ہوئی ہے اُس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ اور اس کا لڑکا جبراً انس بندی اور منبط ولادت اپنے ملک پر ٹھونسا چاہتے تھے۔ ہمارے حکومتی محکمہ منصوبہ بندی نے بھی اس پروگرام کو بڑے طمطراق سے شروع کر رکھا ہے۔ جابجا پبلک مقامات پر بڑے بڑے بورڈ آؤزیاں ہیں جن میں بے شمار بچوں کے سر دکھائے گئے ہیں اور اوپر چلی عنوان سے تحریر ہے: "اس سیلاب کو روکیے؟ ایک تصویر میں ایک لڑکا اور اس میں ایک درجن بچے دکھائے گئے ہیں اور اسے باپ کی گردن پر لاد کر والدین کو اس بلا سے ناگہانی سے ڈرایا گیا ہے۔ یو، این، او، برطانیہ، جرمنی، ناروے، اسٹریلیا، امریکہ سب پاکستان کی آبادی

گھٹانے میں موجودہ حکومت کا ہاتھ بٹا رہے ہیں، کیونکہ تیس سال میں پاکستان کی آبادی دو گنی ہو چکی ہے۔ خطرہ دہشت ہے۔ ”حقوق نسواں کمیٹی“ بھی عورتوں کے اس بنیادی حق سے غافل نہیں رہی ہے کہ انہیں اضافہ آبادی کے ”تخریبی“ کام سے ہٹا کر دوسرے ”تعمیری“ مردانہ مشاغل میں مصروف کیا جائے۔ آخر اس کمیٹی کو اسی حکومت ہی نے تو مقرر کیا ہے جو اپنا فخر یہ کارنامہ یہ بیان کرتی ہے کہ ”پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کسی عورت کو یونیورسٹی کا وائس چانسلر اور فیڈرل پبلک سروس کمیشن کا ممبر مقرر کیا گیا ہے۔ چنانچہ کمیٹی کی رپورٹ کے آخر میں خاندانی منصوبہ بندی کے لیے کچھ نئی قانون سازی بھی تجویز کی گئی ہے۔ رپورٹ کی دفعہ ۱۱ میں کہا گیا ہے:

”خاندانی منصوبہ بندی کے موضوع پر کمیٹی کی خاص توجہ رہی ہے کیونکہ یہ معلوم ہوا ہے کہ خواتین اسی صورت میں زندگی کے تمام شعبوں میں بھرپور حصہ لے سکتی ہیں اور اپنی معاشرتی اور معاشی حیثیت بلند کر سکتی ہیں جبکہ ہمارے خاندان زیادہ بڑے نہ ہوں۔ قانون سازی کے پہلو پر کمیٹی حسب ذیل سفارش کرتی ہے:

(الف) عام دوا فروشوں کے لیے قانونی طور پر فرض کیا دیا جائے کہ وہ موانع حمل موجود رکھیں اور مذکورہ فرض قانونی کو اس کے لائسنس کی شرط قرار دیا جائے۔ علاوہ انہیں شفا خانوں اور اسپتالوں میں موانع حمل کا دافرٹاک شادی شدہ لوگوں میں فوری تقسیم کے لیے موجود رہنا چاہیے۔

(ب) خاندانی منصوبہ بندی کا ممنون ایم، بی، بی، ایس کے نصاب میں بطور لازمی مضمون شامل کیا جائے۔

(ج) میڈیکل سندیافتگان، مرد اور عورت دونوں، جو ڈاکٹری کی پریکٹس نہ کر رہے ہوں ان کو

منصوبہ بندی کی تربیت دی جانی چاہیے اور ہفتہ میں کم از کم دس گھنٹے خدمت انجام دینے پر مجبور کیا جائے۔

(د) مردوں کی شادی کی کم از کم عمر ۱۸ سال سے بڑھا کر اکیس سال کر دی جانی چاہیے۔“

یہاں ایک نہایت اہم اور انتہائی افسوسناک حقیقت پر سے پردہ اٹھا دینا بھی ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ رپورٹ جب بالکل اپنی آخری شکل میں مرتب ہوئی تو اس میں شفا خانوں اور ہسپتالوں کے سامنے ”گورنمنٹ آفیسرز، پرائیویٹ بزنس سنٹرز جہاں دس سے زیادہ افراد کام کرتے ہوں“ کے الفاظ بھی موجود تھے، جنہیں عین آخری وقت جب کمیٹی کے چیئرمین نے دستخط کیے ہیں حذف کیا گیا ہے۔ اسی طرح شادی شدہ لوگوں (MARRIED PERSONS) کے الفاظ رپورٹ کے آخری مسودے میں موجود نہیں تھے، ان کا اضافہ بھی بعد میں ہوا ہے۔ اگر کسی صاحب کو ہماری بات پر یقین نہ آئے تو

وہ اسی رپورٹ کا وہ متن ملاحظہ کر لیں جو ۱۹ جولائی ۱۹۶۶ء کے روزنامہ "سن" لاہور میں شائع ہوا ہے۔ یہ اس اصل رپورٹ کی فوٹو کاپی ہے جو اخبار کو مہیا کی گئی ہے۔ اس میں مذکورہ بالا خط کشیدہ الفاظ مطبوعہ موجود ہیں مگر انہیں قلمزدکریا گیا ہے اگرچہ بغور دیکھنے سے ان کو باسانی پڑھا جاسکتا ہے۔ جہاں تک "شادی شدہ" کے الفاظ کا تعلق ہے یہ دفعہ ۱۱۲ میں تو سرے سے موجود ہی نہیں ہیں، البتہ چیئر مین صاحب نے اپنے قلم سے انہیں آگے چل کر اس خلاصے کی دفعہ ۱۳ میں بڑھایا ہے جو رپورٹ کے آخر میں بطور ضمیمہ درج ہے۔

آخری مرحلے کی یہ رد و بدل اور حذف و اضافہ عیاں کر رہا ہے کہ ان لوگوں کا بس چلے تو یہ پاکستانی قوم کی شرم و حیا اور عصمت و حمیت کا دیوالہ نکال دینا چاہتے ہیں۔ کیا دنیا کے کسی ملک یا قوم میں ایسی مثال موجود ہے کہ وہاں کے ہر میڈیکل اسٹور، شفا خانے، گورنمنٹ کے دفتر اور کاروباری ادارے پر لازم کر دیا گیا ہو کہ وہ مانع حل آلات اور دوائیں ہر کس و نام کس کو فراہم کرتا رہے؟ ضبط و لادت کے حامی چونکہ یہ مسلسل باور کرانے کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ مانع حل دوائیں اور گولیاں بالکل بے ضرر بلکہ محافظہ صحت ہیں، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں روزنامہ "سن" لاہور، مورخہ ۱۶ اپریل ۱۹۶۶ء میں شائع شدہ نیویارک کی تازہ تحقیقاتی رپورٹ کا ضروری حصہ نقل کر دیا جائے جو درج ذیل ہے:

"نیویارک، ۵ اپریل۔ پیورٹوریکو میں قائم شدہ ایک بڑے دوا ساز کارخانے میں مانع حل ادویہ تیار ہوتی ہیں۔ یہاں کام کرنے والے مردوں اور عورتوں کے اجسام میں نسوانی ہارمونوں کی نمایاں کثرت نمودار ہو گئی ہے۔ کیونکہ کارخانے کی فضا اور ہوا جس میں وہ سانس لیتے رہے ہیں اس میں آسٹریجن نامی کیمیاوی مواد سرایت کر چکا ہے۔ نتیجہً کچھ مردوں کی چھاتیاں غیر فطری انداز میں بڑھ گئی ہیں اور قوت مردمی گھٹ گئی ہے۔ پانچ عورتیں جو برتھ کنٹرول کے لیے مستعمل سفوف کو ہاتھ لگاتی تھیں اور اعطارہ میں سے دس جو محض تیار شدہ گولیوں کو مس کرتی تھیں ان کے اندام ہائے نہائی سے غیر معمولی طور پر جو بایان خون شروع ہو گیا۔ ایک سال تک تجرباتی معائنہ و مطالعہ کے بعد اس کے نتائج اٹلانٹا کے وفاقی مرکز میں پیش کیے گئے جو انسداد امراض کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر میلکم ہیزنگٹن جو اس تحقیقات کے نگران تھے، انہوں نے کہا ہے کہ ان گولیوں کی صنعت صحت کے لیے

سنگین خطرات کا باعث ہے، ان سے سرطان کی پیدائش کا اگرچہ قطعی ثبوت نہیں مل سکا لیکن میں شک میں مبتلا ہوں۔ انہوں نے مزید بیان کیا کہ جس کمپنی کا اس مطالعہ و تحقیق سے تعلق ہے وہ سفوف کے گرد و غبار کے کنٹرول میں ایک مثالی معیار کی حامل تھی۔ اس کے باوجود بیماری کا وقوع یہ تقاضا کرتا ہے کہ ان کیمیکلز پر قابو پانے کے لیے کوئی نیا طریق کار وضع کیا جائے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وفاقی محکمہ صحت کے ذمہ دار حضرات ایک عرصہ پہلے اس خطرے سے باخبر تھے لیکن گزشتہ مئی سے جو تحقیقات عمل میں آئی ہے اس نے دستاویزی ثبوت بہم پہنچا دیا ہے۔

اس رپورٹ پر خود کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے ہم یہ بہتر سمجھتے ہیں کہ اسی اخبار "لسن" کے ادارہ کا کچھ حصہ نقل کر دیں جو دوسرے روز، اپریل کو اس رپورٹ پر بحث کرتے ہوئے چھپا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ یہ اخبار سرکاری نقطہ نظر اور پالیسیوں کا بالعموم حامی اور علمبردار ہے۔ ادارہ کے عنوان "گولیاں اور انسان" (PILLS AND THE MAN) ہے۔ اس میں جناب مدیر فرماتے ہیں:

"فطرت انسان سے دانا تر ہے۔ فطرت سے جنگ بلاشبہ بے سود ہے۔ اس مزاحمت میں انسان خود ہی مجروح ہوتا ہے۔ انسان فطرت کو رام کرنے کی کوشش کرتا ہے اور آخر کار فطرت اس کی ہنسی اڑاتی ہے۔ انسان اسے قابو میں لانے کے بجائے خود اس کی گرفت میں آ جاتا ہے۔ فطرتی حدود کو پھاندنے کے بجائے بہتر رہے کہ اس سے دُور سے دُور رہا جائے۔ انسان چاہے خارج میں، چاہے اپنے نفس میں جب فطرت کا مقابلہ کرتا ہے مار کھاتا ہے۔ امریکہ کے مرکز انسداد امراض سے سے جو رپورٹ حال ہی میں ملی ہے وہ یہی کچھ بتاتی ہے، برنٹ کنٹرول کی دوائیں بنانے والے مرد اور عورتیں امراض کا شکار ہیں۔ ان کی صحت خطرات کی زد میں ہے۔ اگر کیمیائی عناصر صحت ہوا کی وساطت سے انسان کے ظاہر و باطن کو متاثر کر سکتے ہیں تو جو انسان یہ دوائیں کھاتے اور استعمال کرتے ہیں ان پر اور ان کی آئندہ نسلوں پر کیا اثرات مترتب ہوتے ہوں گے؟ رپورٹ کی رو سے وہ فیکٹری جس میں دوائیں بنتی ہیں وہ بخارات و غبارات کے کنٹرول کا مثالی و معیاری بندوبست رکھتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ان دواؤں کے خوردبینی ذرات بھی ذہر کا اثر رکھتے ہیں۔ ان دواؤں سے کام لینے والے افراد اور ان کے بچے معلوم نہیں اپنے جسم اور خون میں کیا کچھ جذب کرتے اور آگے منتقل کرتے ہوں گے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں سے مابعد کی مردانہ نسل اپنے عادات و اطوار میں زنجہ پی کار و زافروں مظاہرہ کر رہی ہے اور جہاں تک عورتوں کا تعلق ہے ان میں نسوانی خصائص کمتر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اس رپورٹ سے یہ بھی سبق ملتا ہے کہ قوی صحت ایک ایسا نازک مسئلہ ہے جسے محض صحت کے ناخداؤں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جاسکتا۔ بہتر یہ ہے کہ اُنٹارنچ اختیار کرنے کے بجائے فطرت کی سیدھی جانب ہی رہنے کی کوشش کی جائے۔

نت نئے اعداد و شمار کی شہدہ بازی کے بل پر یہ پراپیگنڈا بھی دن رات کیا جاتا ہے کہ دنیا بالخصوص مشرقی دنیا میں خوراک کی اتنی قلت ہے کہ بچوں کی پیدائش کو روکا نہ گیا تو انسان انسان کو کھانے لگے گا۔ لیکن اس فریب کا پردہ اٹائے دن چاک ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً انگلستان کے اخبار گارڈین (مورخ ۱۲ جنوری ۱۹۷۶ء) میں ایک مبصر رچرڈ نارٹن ٹیلر کا مضمون چھپا ہے جس میں غذائی قحط کو محض ایک سکینڈل ثابت کیا گیا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد سے دنیا کی غذائی پیداوار میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۵ء تک پیداوار میں ایک سو پچیس فیصد اضافہ ہوا ہے جبکہ دنیا کی آبادی صرف ستر لاکھ فی صد بڑھی ہے۔ دنیا بھر میں قریب سو اکر وٹن غذا پیدا ہوتی ہے جس کا آدھا حصہ ترقی یافتہ ممالک چٹ کر جاتے ہیں حالانکہ ان کی آبادی کل دنیا کا چوتھا حصہ ہے۔ امریکہ کے شعبہ زراعت کی سال گذشتہ کی ایک رپورٹ کے مطابق جو ممالک فائدہ باہر سے درآمد کرتے ہیں ان کی تعداد پچاس ہے جن میں سے چھپالیس کی زرعی پیداوار کو ملکی پالیسی کے طور پر عمداً محدود اور کم کر کے رکھا جاتا ہے۔ چین اور ہندوستان میں انسان جتنی خوراک کھاتے ہیں اتنی ہی خوراک ترقی یافتہ ممالک کے جانور کھاتے ہیں۔ اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مغربی ممالک ایشیا اور افریقہ کی آبادی کم کرنے کے لیے جو دوائیں یا آلات بطور امداد بھیجنے کی تکلیف گوارا کرتے ہیں اور جو لڑکچہ روانہ کرتے ہیں کیا اس کے عوض میں وہ انسانی ہمدردی کے تحت اپنے مں کے کتوں، بلیوں، گھوڑوں اور بہت سے دوسرے غیر ضروری پالتو اور جنگلی جانوروں کا خاتمہ یا منصوبہ بندی کر کے اور ان کی خوراک بچا کر مشرقی ممالک کے سپرد نہیں کر سکتے؟ مگر وہ چونکہ جانتے ہیں کہ مانع حل گولیاں کھائے بغیر نسوانی حیا کا خاتمہ نہیں ہو سکتا اور مادر پدر آنا دتمند ان کے حسب مشا بر پا نہیں ہو سکتا اس لیے وہ خوراک کی منصفانہ تقسیم سے زیادہ گولیاں اور آئی۔یو۔ای باٹھنے کی فکر میں ہیں، حالانکہ غیر متمدن اور غیر ترقی یافتہ ممالک کے عوام ان عطیات کی وصولی کے لیے تیار نہیں ہیں۔ بھارت کے نئے فیملی پلیننگ کے وزیر نے کہا کہ اس لفظ سے عوام اتنے متنفر ہیں کہ میں محکمہ کے نام بدل کر فیملی ویلفیئر رکھنا چاہتا ہوں۔ مگر کیا کسی شے کا محض نام بدل دینے سے اس کی حقیقت بھی بدل سکتی